Journal of law social and management sciences 2 (1) 01-13, 2023
Journal home page: https://jlsms.org/index.php/jlsms

Open Access
ISSN: 2959-3867

.An Evolution of state and civilization: a comprehensive review

”ریاست وتہذیب کے ارتقا کا جائزہ: تاریخی، سیاسی وفکری تناظر میں“

Dr. Muhammad Ali Junaid*[1] Muhammad Zaman*[2]
*[1] Research Scholar, Visiting Faculty Member, University of Karachi
*[2]Research Scholar, Department of Political Science, University of Karachi
E-mail: Majunaid@live.com*[1] zaman_dpsuok@gmail.com *[2]

Abstract: From this whole discussion, it can be concluded that the state is the name of an evolutionary,historical and political entity, which is the result of centuries of intellectual and conscious evolution, from which emerged the concept of the Machiavellian nation-state of the post-modern renaissance, which emerged in Europe. It was gradually established throughout the world until its colonisation, despite all the historical and theoretical debates, we are unable to determine the exact age and origin of the history of the state with a cent per cent certainty. The victory of patriarchal society over matriarchal society and the rise of religions established and perpetuated the modern conscious state, which evolved from urban municipalities to empires with the passage of t time and it paved the way for medieval and modern state culture. In this context, We can rely on the historical books to some extent, determining the date from the remaining antiquities is a relatively modern method, which is related to the purely empirical school, so it is difficult for Common political scientists to refer to this applied type of historiography directly. In this regard, political experts political and historical historians are forced to refer to speculative philosophy. Still, due to some limitations, these methods also feel unable to speak one hundred per cent about all investigations, thus historical books and monuments. From the overall observation and study of the discovery and investigation of antiquity, we can say with certainty without exaggeration that the state had its beginning in the middle of 10,000 to 5,000 BC.

Keywords: Punjabi short stories, novels, language, literature and culture.

ریاست سیاست کا بنیادی موضوع تصور کی جاتی ہے، جو اپنے وجود، ارتقا، اور خود میں بستے انسانی منظم معاشرے کے تناظر میں ایک معقولی قوت پر دارومدار رکھتے وجود کا درجہ رکھتی ہے، اس تحقیق میں ہم مختصر طور پر ریاست کے فکری وتاریخی ارتقا کے کچھ پہلوؤں کو تاریخی شعور کی روشنی میں نظری وقیاسی دیکھنے کی کوشش کریں گے۔ ریاست کو اردو میں ریاست، مملکت اور سلطنت کے الفاظ سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ ان تینوں کا مادہ عربی زبان میں ملتا ہے۔ یہ عربی سے اردو میں وارد ہوئے ہیں۔ یہ ایک دوسرے کے مترادف الفاظ شمار ہوتے ہیں۔ ہم ذیل میں مختصر طور پر لغت کے تناظر میں اس کا جائزہ لیتے ہیں۔ ریاست عربی لفظ رئیس سے نکلا ہے۔ یہ لفظ عربی میں صدر، سربراہ، چیئرمین، چیف، ہیڈ اور پرنسپل وغیرہ کے لیے مستعمل ہے[1]۔ اسی طرح عربی میں ممول سرمایہ دار کو کہتے ہیں، ملوک بادشاہ کو کہا جاتا ہے۔ حکومت کو لفظ مُلک سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ مَلِک بھی بادشاہ کو ہی کہتے ہیں[2]۔ بعض کا کہنا ہے کہ عربی لفظ مملکت جس کے معنی سلطنت، بادشاہی اور حکومت کے ہیں[3]، کا اصل لفظ مملوکہ یا مملوک ہے۔ جن کے معنی قبضہ کی گئی شہ یا غلام کے بھی ہوتے ہیں۔ جیسا کہ مصر کے غلام حکمران مملوکِ مصر کہلاتے تھے۔ مملوک کو مَلک یعنی مالک یا حاکم کی ملکیت بھی گردانا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے مملکت وہ علاقہ ہوا جہاں کوئی مَلِک حاکم سمجھا جاتا ہو۔ اس کی تصدیق مندرجہ ذیل قرآنی آیت سے بھی ہوتی ہے

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ٘ وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُؕ بِیَدِكَ الْخَیْرُؕ اِنَّكَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔[4]

ترجمہ: ”تو کہہ اے اللہ، بادشاہی کے مالک! جسے تو چاہتا ہے سلطنت دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے سلطنت چھین لیتا ہے، جسے تو چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے تو چاہے ذلیل کرتا ہے، سب خوبی تیرے ہاتھ میں ہے، بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔“

اسی طرح عربی لفظ سلطان بھی طاقت، قوت، حکومت و مملکت کے مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ لفظ سُلطن سے ہی لفظ سلطنت بنا ہوا اغلباً معلوم پڑتا ہے۔ ابن منظور کا کہنا کہ سُلطن کے معنی حجت اور برہان کے بھی آئے ہیں اور حکمران کے معنی بھی لیے جاتے ہیں۔ یہ لفظ مذکر ومؤنث دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ جب کہ ساتھ ہی ساتھ اس کے معنی حکمران کا اقتدار اور اس کی قوت کے لیے بھی آئے ہیں[5]۔

ریاست سے مراد کیا ہے؟

اس پیرائے میں ریاست وہ علاقہ ہے جہاں آبادی بستی ہو اور اس پر کسی رئیس کی سیاسی یا آئینی حکومت واقتدار قائم ہو۔ عین اسی طرح مملکت بھی ایسا ہی علاقہ تصور ہوتی ہے، جس کا حاکم کوئی ملوک یا مَلِک ہو۔ یوں سلطنت میں ایسا ہی اثر ونفوذ سُلطن سے متعلق ہوتا ہے۔

انگریزی میں ان الفاظ کے لئے لفظ (اسٹیٹ) استعمال ہوتا ہے جو بذاتِ خود لاطینی لفظ اسٹیٹ ری پبلکے سے اخذ شدہ ہے، بعدِ ازاں لفظ

Copyright © Habibia Research Academy

(ریپبلیکے) سے انگریزی لفظ ری پبلک بمعنی الجمہوریہ اخذ کیا گیا۔

انگریزی میں ان الفاظ کے لیے اسٹیٹ یا ریاست [6] کہنے کو اُس معاشرتی وسیاسی تنظیم کا نام ہے جو سیاسی جسد بھی رکھتی ہے۔ جس کو ہم بند لفظوں میں حکومتی انجمنوں کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔ لہذا ریاست وہ انجمن ہوتی ہے جو مقاصد کے لحاظ سے دیگر انجمنوں سے اس لیے مختلف ہوتی ہے کیونکہ یہ حکم بھی دیتی ہے اور اسے نافذ بھی کرتی ہے۔ لہذا قانون سازی اور شہریوں کو تحفظ فراہم کرنا ریاست کی ذمہ داریوں میں شامل ہوتا ہے۔ یہ اپنی حدود میں اقتدار اعلیٰ کے ذریعے عمل کرتی ہے، جو ریاست میں سب سے اعلیٰ و فائق حق تصور کیا جاتا ہے۔ کھلے معنوں میں ریاست ایک شہری و عوامی راضی نامہ یا کلی اطاعت عامہ پر استوار ہوتا بندھن ہوتی ہے، چناچہ انفرادی طور پر ریاست اور شہریوں کے درمیان، جہاں ان کے تنازعات قانون کی روشنی میں حل کیے جاتے ہیں۔ متعدد ریاستوں میں جیسا کہ امریکا، آسٹریلیا، نائیجیریا، میکسیکو اور برازیل وغیرہ میں ریاست سے مراد وہ سیاسی اکائی بھی لی جاتی ہے جو بذات خود مقتدر نہ ہو مگر ایک بڑے وفاق یا اتحاد کا حصہ ضرور ہو۔

ریاست کی ابتدا اور مفکرین کے مواقف:

جہاں تک ریاست کی ابتدا کا معاملہ ہے تو، تاریخ و فلسفہ اسے نظری و قیاسی طور پر ارتقائی عمل کے طور پر قایم ہوتا دیکھتے ہیں۔ اس کی ابتدا کی بابت ہمارے پاس کوئی وحی یا صد فیصد سائنسی تحقیق موجود نہیں ہے کہ اسے حرف آخر قرار دیا جاسکے، یوں بہت حد تک یہ دنیا میں خطے کے لحاظ سے تفاوت کا شکار ہوتی نظری و معقولی میدان بحث بنتی نظر آتی ہے۔ قیاساً و تحقیقاً اولین ریاستیں اور سامراجی حکومتیں اول مشرق سے نمودار ہوئی تھیں کم از کم توریت، انجیل، وید اور ہندو رزمیہ داستانوں سے گل گامش کی داستان کے مطالعہ سے قیاساً یہی امر جغرافیائی طور پر چھلکتا نظر آتا ہے۔ چونکہ انسانی آبادی کی ابتدا بھی یہیں سے ہوئی تھی، لہذا محققین کا ایک بڑا طبقہ یہی گمان کرتا ہے، اب اہل افریقہ بھی یہی دعویٰ کرنے لگے ہیں کہ تہذیب کے موسس وہ ہی ہیں۔ مگر اتنا طے ہے کہ مغرب میں اس بحث پر غور و خوض کی ابتدا غالباً قدیم یونان سے ہوئی تھی۔ مشہور تاریخ دان اور مفکر پرفیسر ٹوئن بی آرنلڈ کے مطابق موجودہ دور میں مغرب سے مراد وہ یورپی علاقہ ہے جو کیتھولک اور پروٹسٹنٹ عیسائیوں کے معاشرے پر مشتمل ہے۔ دوسرے لفظوں میں مغرب رومن پوپس کے روحانی اقتدار کا خطہ ہے [7]۔ مغرب جن ممالک پر مشتمل ہے وہ تمام کے تمام بحیرہ روم کے شمال میں واقع ہیں۔ ان میں آج پرتگال، اسپین، فرانس، اطالیہ، جرمنی اور ان سے ملحق تمام چھوٹے ممالک، نیز جزائر برطانیہ شامل ہیں۔

مغرب اپنے قدیم علمی سرمائے کو یونان سے دریافت کرتا ہوا اور اس سے اپنا علمی و فکری نسب جا ملاتا نظر آتا ہے، جو آج ایک نسبتاً کم ترقی یافتہ یورپی ملک سمجھا جاتا ہے۔

یہاں کے دو مفکرین افلاطون وارسطو ریاست و سیاست کے مباحث پر اپنی تحریروں اور فلسفے کے سبب سیاسی سائنسدانوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ انہوں نے شہری حکومت کو اس ضمن میں موضوع بحث بنایا تھا، جو ایک مثالی نوعیت کی انجمن تھی، جس میں افراد و برادری کی مذہبی، ثقافتی، سیاسی اور معاشی ضروریات کو پورا کیا جاسکتا تھا۔ اس شہری حکومت یعنی پولس کی خود موزوئیت کو ارسطو نے ترقی کرتی اخلاقیات کا ذریعہ قرار دیا تھا۔ اور مابعد اسی یونانی فکر نے جدید مغربی دنیا پر گہرے اثرات مرتب کئے ہیں۔ انہوں نے اس سے قومیت کا تصور اخذ کیا۔ جس سے کسی مخصوص علاقے میں آبادی، ثقافت، تاریخ اور زبان کی بنیاد پر لوگ قوم کی شکل میں ڈھل سکتے ہیں۔ جو رومن ریس پبلیکا اور دولت مشترکہ [8] موجودہ جدید ریاست کے لیے ایک نمونہ کا درجہ رکھتی ہے۔

رومن شہنشاہت میں ریس پبلیکا وہ قانونی نظام تھا جس کا دائرہ ساعت تمام رومی باشندوں تک وسعت رکھتا تھا۔ جس سے وہ حقوق و فرائض حاصل کرتے تھے۔ رومن سلطنت کی شکست و ریخت نے یورپ میں امن و امان کی ضرورت محسوس کی، جس کے دوران یورپ باہم گتھم گتھا جاگیرداروں اور ان کے جاگیرداری نظام کو مجبوری سے دیکھتا رہا۔ یہاں تک سولہویں صدی آپہنچی، جب جدید ریاست کا تصور ابھرا، جس کو میکاوَلی (اطالیہ) اور جین بودین (فرانس) نے اپنی تحریروں سے قائم کیا تھا۔ ان دونوں نے فکری طور پر اقوام کو اتحاد، ریاست اور قومیت کے جدید نظریات عطا کیے تھے۔ میکاوَلی نے اپنی کتاب بادشاہ [9] میں لکھا ہے کہ تمام طاقتیں جو انسان پر قبضہ یا اقتدار رکھتی ہیں، وہ ریاستیں ہیں اور یہ یا تو جمہوریتیں ہیں یا پھر بادشاہتیں ہیں [10]۔

جین بودین نے لوگوں کو بتایا کہ ریاست کی بنیاد طاقت پر رکھی گئی ہے۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ ریاست بہت سے خاندانوں کے ایک قانونی نوعیت کے اجتماع کا نام ہے اور یہ قانونی تنظیم نہ صرف کسی طے شدہ قانون کے

تحت وجود میں آتی ہے، بلکہ اسے خود قانون سازی کے اختیارات بھی حاصل ہوتے ہیں[11]۔

میکاؤلی نے اخلاقی پہلو سے قطعہ نظر یہ کہا تھا کہ حکومتی استحکام، طاقت، جبر اور آزادی سے قائم کرنے کے لیے ہر جائز وناجائز طریقے اختیار کرنا حکومتوں کے لیے جائز ہوتا ہے۔ جب کہ بودین اس کے برخلاف کہتا ہے کہ چونکہ صرف طاقت تنہا مقتدر نہیں ہوتی ہے، لہذا حکومت کو اخلاقی اقدار لازماًمد نظر رکھنا چاہیے۔

معاہدہ عمرانی سے مراد کیا ہے؟:

سترہویں صدی میں بادشاہوں کے حقوق ربانی کا نظریہ[12] پروان چڑھا تو اس عہد میں بادشاہتیں پورے یورپ پر غالب طریقہ حکومت کے طور پر رائج تھیں۔ یوں نظریہ عمرانی کئی مروجہ عقاید و نظریات کے رد میں ابھرا[13]۔ لہذا، نظریہ جبر و قوت، نظریہ ارتقا، نظریہ نمو و بالیدگی، یا پھر نظریہ حقوقِ ربانی کے برخلاف قانونی رضا کے پیرائے میں معاہدہ عمرانی کی بابت قیاس آرائیاں شروع ہوئیں۔

لہذا تھامس ہابس نے فطری ریاست کی تصویر کشی اپنی کتاب عظیم عفریت[14] میں پیش کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ حالت فطری میں انسان جھگڑالو اور وحشی قسم کا ہوا کرتا تھا اور اس دور میں ہر طرف طاقت کا راج قایم تھا[15]۔ نیتجتاًلوگوں نے مصیبت سے نجات حاصل کرنے اور امن و امان کے حصول یا پھر، اپنی اپنی جائیدادوں وجانوں کے تحفظ کے لیے معاہدہ کرکے ریاست بنائی تھی۔ انھونے ایک فرد کو جو اس معاہدے میں شامل نہ تھا، کو خود میں سے تجرباًحاکم بنایا۔ اس کی رو سے معاہدے میں شامل نہ ہونے کی وجہ سے حاکمِ وقت عوام کا پابند نہیں تھا۔ لہذا وہ مکمل طور پر اختیارات، قوت اور حکومت کا اہل تھا۔ اور اس کو اس وقت تک ہٹایا نہیں جاسکتا تھا، جب تک وہ لوگوں کی نجی زندگی میں مداخلت نہ کرتا پھرے اور ان کی جان ومال کو برباد نہ کرتا پھرے۔ وہ سیکولر رویہ کا اظہار کرتے ہوئے رابرٹ ہولی اوک سے قبل کلیسا کو حاکم وقت کے ماتحت رکھنا پسند کرتا تھا اور اسے ریاستی معاملات میں مداخلت سے پرہیز کرنے کا مشورہ دیا کرتا تھا۔ ہابس بادشاہ کو اس لیے مطلق العنان کہتا ہے تاکہ وہ لوگوں کے حقوق کی بہتر حفاظت کرسکے۔

اس کے ہم عصر انگریز مفکر جان لاک نے اپنے کتاب[16] میں موجود افکار کی رو سے ایک طرح سے معاہدہ عمرانی میں ہابس سے حالت فطری کی بدترین تصویر کشی کرنے پر اختلاف کیا ہے۔ اس نے جواباً یہ کہا ہے کہ انسان فطرتاً امن پسند نوعیت کا حامل رہا ہے، یہ الگ امر ہے کہ وہ کبھی تہزیب سے خارض غیر انسانی رویہ کا اظہار کرجاتا ہے۔ حالت فطری میں انسان ایسا نہیں ہوا کرتا تھا جیسا کہ ہابس نے اسے پیش کیا تھا، بلکہ قدیم انسان اس کی درمیانی حالت کا حامل تھا، نا تو بہت جھگڑالو تھا اور نہ ہی زیادہ امن پسند مزاج کا حامل تھا۔ ریاست اس لیے معاہدے کے بعد نمودار ہوئی کیونکہ انسان کو تحفظ کی ضرورت تھی۔ تاکہ وہ اپنے باشندوں کے جان، مال اور عزت کو تحفظ فراہم کرسکے۔ لہذا انہوں نے اس ضمن میں باہم دو طرفہ معاہدہ کیا۔ ایک لوگوں نے باہم اجتماعی طور پر اپنے درمیان اور دوسرا حاکموں سے کیا جنھیں انھونے اپنے میں سے باہم اتفاق سے منتخب کیا تھا۔ لہذا ریاست خود مقصد نہیں ہے، بلکہ مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ حکومت عوام کی خادم ہے نہ کہ عوام اس کی غلام ہے۔ حکومت شہریوں کو ان کے بنیادی فطری حقوق فراہم کرے اور ان کی نجی زندگی میں مداخلت سے پرہیز کرے۔ لاک کے نظریات نے انقلاب امریکا و فرانس کے معاہدین کو بھی متاثر کیا تھا۔ معاہدہ عمرانی کا تیسرے موئد روسو تھا، جو فرانس سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے اپنی شہرہ آفاق کتاب[17] میں

بحث پیش کی ہے کہ انسان حالت فطری میں معصوم وپرامن جانوروں کی طرح ایک کسی مطلب و غرض کے بغیر مفروض کردہ رومانوی حالت میں رہا کرتا تھا۔ انسان کی مصیبت ذاتی ملکیت اور معاہدہ کے بعد قائم شدہ ریاست کے نمودار ہونے سے شروع ہوئی۔ مگر یہ ریاست لوگوں کی اپنی تھی، وہ اس کے حاکم تھے اور اپنے درمیان میں سے کسی اہل فرد کو حاکم بنا دیتے تھے۔ حاکم کسی منتظم سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ اسے لوگوں کے معاملات میں مداخلت کرنے یا ان کی مرضی کے خلاف کچھ کرنے کا حق حاصل نہیں تھا۔ حاکم لوگوں کو سزا دینے سے بھی بچنا چاہیے، سوائے اس کے جب لوگ ایک دوسرے کے ساتھ زیادتی کرنے لگیں۔ اس نے مرضی عامہ کے تصور کو متعارف کروایا جو اس کی کتاب کی جان سمجھا جاتا ہے۔

ہیگل کے بعد کی دنیا[18]:

انیسویں صدی میں ہیگل کا نام ایک معروف عینیت پسند مفکر کے طور پر سامنے آتا دکھتا ہے، جو اضداد کے ٹکراؤ پر یقین رکھتا تھا۔ جدلیاتی مادیت کا تصور مارکس نے اسی سے اخذ کیا تھا۔ اس نے ریاست کو خود ایک

مقصد قرار دیا[19] ہے، جسے مابعد ریاست پرستی اور اشتراکی ریاستی مقصدیت کے مویدوں نے اجتماعیت کے نام پر پر اختیار کیا۔ اس کے نزدیک ریاست ایک مصنوعی ذریعہ ہے، اسی قسم کا تصور مشرق بعید کی بیلٹ کی اجتماعی حیات میں بھی ملتا ہے، جہاں اجتماع یا خاندان فرد واحد کی انا یا میں میں پنہاں خودی سے زیادہ اہم معلوم پڑتا ہے، جو مفادات میں ربط پیدا کر کے افراد میں یکجہتی اور ریاست کی حدود میں استحکام پیدا کرتی ہے، ریاست کے عضوی عقیدہ کے حامل افراد کا موقف رہا ہے کہ ریاست انسان کی طرح ایک بتدریج نمو حاصل کردہ نامیہ ہے جو طفولیت سے باشعور بلوغت تک انسان کی رح جسمانی ساخت و وجود کی طرح نمو و بالیدگی حاصل کر کے موجودہ ہیبت تک جا پہنچی اس تصور کے افراد اس ضمن ہیگل کو بھی اپنا ہم خیال تصور کرتے ہیں۔

بعد ازاں افادیتی مفکر جریمی بینتھم[20] اور مارکس نے بھی ریاست کو جبر کا آلہ گردانا تھا، جو ان کے مطابق طبقہ اعلیٰ اور سرمایہ دار طبقے کے مفادات کے تحفظ کے لیے تخلیق کی گئی ہے۔ مارکس و اینجلز نے اپنے اشتراکی منشور[21] میں لوگوں کو مشورہ دیا تھا کہ آزادی کے لیے انہیں پرولتاری حکومتوں سے چھٹکارا حاصل کرنا لازم ہو چکا ہے۔ اس ارتقائی جدوجہد میں آخر کار ریاست ختم ہو جائے گا اور طبقات کے بغیر معاشرہ ابھرے گا۔ جہاں ذرائع پیداوار پر مزدور قابض ہوں گے اور انصاف کے ساتھ ساتھ اشیائے ضرورت اور جائیداد لوگوں میں منقسم ہو گی۔

بیسویں صدی میں ریاست کے متعلق یہ تصور بھی سامنے آیا کہ ریاست کا وجود لازمی و ضروری نہیں ہے۔ یہ دراصل طاقت و جبر کا نام ہے۔ مگر جلد یہ نظریہ خود یورپ کے گلے میں اٹکنے لگا اور اپنی موت آپ مر گیا یوں نتیجتاً نو مارکسی اصلاحی نظریات نمودار ہوئے۔ دوسری طرف ان معاشی و سیاسی فکری دباو کی علیت نے سرمایہ داروں کو سوچنے پر مجبور کیا اور اصلاح کی حکمت بیدار کی، نتیجتاً خود انہیں مستقبل میں اپنا وجود اپنے نظریے کے ذریعے مردہ ہوتا نظر آیا۔ اس طرح فلاحی ریاست کا تصور سامنے آیا۔ جس کے مطابق حکومت کا قیام اس لیے ضروری ہے کہ ریاست لوگوں کو نہ صرف تحفظ دے، بلکہ ان کے تمام بنیادی حقوق اور ضرورتیں پوری کرے۔

بتدریجاً قومیت کی بنیاد پر لڑی جانے والی عالمی جنگوں کے رد عمل میں بین الاقوامیت کے نظریات پروان چڑھے، جن کو ہینس کیلسن[22] اور آسکر اکھازو[23] نے پیش کیا تھا۔ کیلسن نے یہ مؤقف اختیار کیا کہ ریاست آسان لفظوں میں ایک مقصد و مربوط آئینی ڈھانچہ ہوتی ہے، جو فرد سے برتر نہیں ہوتی ہے۔ مگر ساتھ ساتھ یہ صرف اپنے وجود اور تجربات سے برقرار نہیں رہ سکتی ہے۔ بلکہ اسے بیرونی دنیا سے تعلق کے ساتھ ہی رہنا ہو گا۔

اسی طرح اکھازو نے ایسی ریاست کا تصور پروان چڑھایا جس میں تمام عالمی خصوصیات موجود ہوں۔ اور ہر ریاست اور اکائی ایک دوسرے سے الگ نہ ہو، بلکہ ساری دنیا ایک کل کی طرح مربوط اور یکساں معیار اختیار کر کے باہمی یکجہتی پیدا کرے[24]۔ ماضی میں اسی طرح کبھی اس سے قبل کانٹ نے بھی دولت مشترکہ کا خواب دیکھا تھا، جو باہمی آزادی و احترام کے جذبے پر قائم ہو اور لوگ امن و امان باہمی گفت و شنید سے قائم کریں۔

ریاست کے ارتقا کا قیاسی منظر نامہ:

ریاست ایک تاریخی ارتقائی تخلیق ہے جو بتدریج انسانی شعور کی ترقی اور تہذیبوں کے آغاز کے سبب پھیلنا شروع ہوئی۔ انسانی وجود کی ابتداء، دنیا میں اس کی تاریخ اور تہذیب و تمدن ہمارا موضوع بحث نہیں ہے۔ اتنا یقیناً کہا جا سکتا ہے کہ ریاست کا تصور زراعت کی ابتداء، گاؤں کے قیام، جائیداد کے تصورات اور اور ان کی بقا کے مطالبے اور خواہش کے کچھ عرصے بعد نمودار ہو گیا ہو گا، جس کی کوکھ سے اول شہری ریاست قایم ہوئی ہو گی جسے اس دور تک ایک ریاست ہی گردانا جاتا ہو گا۔ انسان نے حاکمیت و ریاست کی ابتدا گاؤں کے مکھیا اور مذہبی مندر یا مقام کے نگران پروہت کے اثر و نفوذ کی کامیابی دیکھ کر کی ہو گی۔ مافوق الفطرت قوتوں پر اعتقاد رکھتا اور مظاہر عالم کو خدا مانتا انسان کائنات پر ان دیکھی قوت کی حکمرانی سے متاثر ہو کر دنیا میں بھی اس تجربے کو استعمال کرنے پر مجبور ہو گئی ہو گی۔

جب انسان نے خانہ بدوشی چھوڑی ہو گی، زراعت کے لیے دریا یا پانی کے اریب قریب زراعت شروع کی ہو گی، تو خاندان بن کر رہنے پر مجبور ہو گیا ہو گا۔ خاندان ایک خون و نسل کی بنیاد پر ایک چھت کے نیچے اتحاد سے رہنے کا نام ہے۔ ایک خاندان کی مختلف اولادوں نے برادری و قبیلے کی شکل اختیار کی ہو گی، جس میں وسعت اور فاصلے نے انہیں لاتعداد خاندانوں، قبیلوں میں بانٹ دیا ہو گا۔ ان کے بڑے علاقے کو گاؤں یا

دیہات تصور کیا جانے لگا ہو گا۔ ان دیہاتوں سے جب صنعت و حرفت کی صلاحیتیں نکل کر پھیلی ہوں گی تو ان کے مختلف دیہاتوں کے مجموعے سے شہر وجود میں آئے ہوں گے، جو ان کا صدر مقام ہو گا۔ وہاں صنعت و تجارت کی ابتدا ہوئی ہو گی۔ یہ اول شہری و ضلعی حکومت ہو گی۔ ان شہری حکومتوں کے اتحاد سے ریاست کی جدید شکل نمودار ہوئی ہو گی۔

ارسطو کے سامنے بھی غالباً یہی معمہ موجود تھا۔ اس نے کہا کہ مرد وعورت کی تولید سے گھرانے کی تشکیل ہوئی ہے۔ اس کے بقول گھرانے کی تشکیل مردوں نے گھر کی عورتوں اور غلاموں کی انجمن سے کی تھی۔ انسانوں کی یہ انجمن جو فطرت نے روزانہ کی ضروریات کی تسکین کے لیے بنائی گھرانہ کہلاتی ہے۔ جب کہ اگلا مقام دیہات ہے، جو متعدد گھرانوں پر مشتمل ایک ایسی انجمن کی تشکیل ہے جو روزمرہ کی ضروریات سے بڑھ کر پیش آنے والے مسائل کی تسکین کرتی ہے[25]۔ متعدد دیہاتوں پر مشتمل جو آخری انجمن وجود میں آتی ہے، اس کو ریاست کہتے ہیں۔ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے سیاسی حیوان ہے۔ اس کے مطابق جو انسان معاشرت پسند نہ ہو وہ یا تو دیوتا ہوتا ہے یا وحشی درندہ سمجھا جاتا ہے[26]۔

اس کے ہزار سال بعد ابن خلدون نے اس بحث کو نہایت معقول انداز میں سمیٹا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ "دیہاتی دیہات میں رہنے کے لیے اس لیے مجبور ہیں کہ وہاں کھلے میدان ہوتے ہیں، جو شہر میں نہیں ہوتے ہیں۔ انہیں کھلے میدانوں میں وہ کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ جانوروں کے لیے باڑے اور چراہ گاہیں بناتے ہیں۔ ان کی دیہاتی زندگی ان کی اجتماعی زندگی کے لیے مفید و معاون ہے۔ روزی پیدا کرنے کے لیے ہاتھ بٹانا ضروری ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو زندگی عذاب بن جائے۔ تمام کاروبار رک جائے اور آرام کا تصور فوت ہو جائے۔

جب مختلف پیشہ ور فراخ حال و مال ہو جاتے ہیں اور ضرورت سے زائد مال و فرصت حاصل ہوتی ہے، تو انہیں عشرت و سکون کی زندگی کی خواہش ہوتی ہے۔ معمول کی ضروری اشیا سے بڑھ کر چیزیں و صلاحیتیں مطلوب ہوتی ہیں، تو باہمی تعاون کرتے ہیں۔ اچھا کھاتے اور پہنتے ہیں۔ بڑے گھر، بنگلے بناتے اور ان کو سجاتے ہیں۔ ان کی آرائش کرتے ہیں۔ سامان سے بھرتے ہیں تو شہروں کی بنیاد رکھتے ہیں، تا کہ مادی زندگی یا عیش و آرام انتہا کو پہنچے"[27]۔

یہ دونوں حضرات مذکورہ فلسفیانہ بحث انیجلز اور ووڈ روولسن سے صدیوں قبل کر چکے تھے۔ میں یہ واضح کر دوں کہ اس سے قبل ابتدا میں جو تصویر کشی کی گئی، وہ راقم نے ذاتی طور پر پیش کی ہے۔ ارسطو اور خلدون کے خیالات کو تقابلے کے لیے ذکر کر دیا گیا ہے۔ وہ ان کا تخیل تھا، یہ میرا موقف ہے۔ یہ امر اس بحث میں مد نظر رہے کہ ہمارے پاس اس ضمن میں کوئی صد فیصد تیر بہ ہدف تاریخی معتبر شہادت موجود نہیں ہے، جس کی بنیاد پر ریاست کو عمرانی معاہدے، جبر و قوت یا نظریہ ربانی کے ذریعے تخلیق شدہ تصور کرتے پھریں۔ یہ دراصل مفکرین کی ذہنی تخیلات کا کمال وارتقا ہے۔ یہ ایک جانی مانی بات ہے کہ ریاست درحقیقت ایک تاریخی ارتقائی تخلیق کا نام ہے۔ آج تک کوئی ایسی دلیل موجود پائی نہیں جاتی ہے کہ اس کے موجد و مبتدا کا واضح نام پیش کر سکیں۔ خدا نے بھی کسی الوہی کتاب میں یا سامی المذاہب میں اس کی تخلیق خود سے وابستہ نہیں کی ہے۔ اس نے خود کو کل کائنات کا خالق و مالک مانا یا قرار دیا ہے، اسی لیے وہ اقتدار اعلیٰ کا مالک تصور کیا جاتا ہے۔

ریاست کسی خود مختار علاقے کی سب سے مقتدر سیاسی تنظیم کا نام ہے، جو علاقے کی آبادی کو مختلف قوتی قاہرانہ اعمال اور نظریاتی ذرائع سے اپنے احکام کا پابند بناتی ہے۔ کوئی بھی ریاست ازل سے موجود نہیں رہی ہے اور نہ آسمان سے اتری ہے۔ یہ انسانوں کا ہی بنایا ہوا ایک سماجی ادارہ ہے۔ جس کی تشکیل ایک، دو دن میں کسی کے حکم سے نہیں ہوئی ہے، بلکہ اس نے گزشتہ دس پندرہ ہزار برس میں ارتقا کی متعدد منزلیں طے کی ہیں۔ ریاست دراصل اس وقت وجود میں آئی جب معاشرتی طبقہ بندی کا رواج عام ہوا اور دولت آفرینی کے ذرائع (زمین، پیداوار اور آلات پیداوار وغیرہ) چند افراد کی ذاتی ملکیت بن گئے۔ ریاست انسانوں کی پہلی بااختیار معاشرتی تنظیم بھی نہیں ہے، کیوں کہ یہ عام فہم بات ہے کہ اس سے قبل خاندان، گھرانے، برادریاں اور قبیلے ریاست سے لاکھوں برس بیشتر موجود تھے۔ ان کے درمیان عرصہ دراز سے اصول و ضابطے بھی موجود پائے جاتے تھے اور ان کو معاشرتی ضرورتوں نے رواج دیا تھا۔ رواج یہ بھی بتاتا ہے کہ اس دور میں خاندان کا بزرگ، قبیلے کا سردار اور گاؤں کا مکھیا سب سے مقتدر شخص ہوتا تھا۔ حاکمیت کا مرکز بھی رواج ہی تھا، جس کی حیثیت ہر چند کہ اخلاقی نوعیت کی حامل تھی، مگر بحر حال جمعیت کے ہر فرد کو رواج کی حاکمیت تسلیم کرنی پڑتی تھی[28]۔

ان پرانی تنظیموں اور ریاست کے درمیان بنیادی فرق یہ موجود تھا کہ

پرانی تنظیموں کی وحدت کی بنیاد خونی رشتے، مذہبی عقائد اور زبان کی یکسانیت پر استوار تھی۔ کسی مخصوص علاقے سے وابستگی شرط نہ تھی۔ بدوی قبیلے تو صحرا نورد ہوا کرتے تھے، جب کہ ریاست ایک علاقائی یا جغرافیائی سیاسی وحدت ہے جو خونی رشتوں سے متعین نہیں ہوتی ہے، بلکہ اس کی حدود میں ایک سے زائد قبیلوں، قوموں، زبانوں اور مذہبوں کی گنجائش موجود ہوتی ہے۔ ایک اہم فرق یہ بھی ملتا ہے کہ خاندان، برادریاں، قبیلے اور گاؤں کی پرانی تنظیمیں طبقوں میں بٹی ہوئی نہیں تھیں۔ ان میں کوئی حاکم تھا اور نہ محکوم، بلکہ اس کے برعکس ریاست کی نوعیت ابتدا سے ہی طبقاتی رہی ہے۔ وہ معاشرے کے طبقات میں بٹ جانے کی وجہ سے وجود میں آئی۔ اس کا منصب ہی یہ ہے کہ حاکم طبقے کی بالادستی کا بچاؤ کیا جائے۔

غرض یہ کہ ریاست تھیوکریسی (پیشواؤں کی حکومت) ہو یا بادشاہت، جمہوری ہو یا اشتراکی، یہ بنیادی طور پر طبقاتی ادارہ ہے۔ تھیوکریسی اگر مذہبی پیشواؤں کے اقتدار و مفاد کا تحفظ کرتی ہے تو ملوکیت کا فریضہ بادشاہ اور شاہی خاندان کے اقتدار کو قائم رکھنا ہوتا ہے۔ بورژوا جمہوریتیں سرمایہ داری طبقے کی محافظ ہوتی ہیں، جب کہ سوشلسٹ ریاستیں محنت کش طبقوں کے مفاد کا تحفظ کرتی ہیں[29]۔

ریاست کی قیاسی ابتدا کا معاملہ

اہل مغرب اور ان سے مرعوب اہل مشرق ریاست کو مغربی ایجاد و اختراع تصور کرتے ہیں۔ حالانکہ ریاست جب نمودار ہوئی تو اس وقت اغلباً یورپ میں آبادی موجود نہیں تھی اور جہاں آبادی موجود تھی وہاں برفانی دور برپا تھا۔ بعض آثار کی رو سے انسانی طبیعت جنگلی واقع ہوئی تھی۔ اہل یونان زیادہ سے زیادہ ۱۵۰۰ قبل مسیح میں اس خطے میں وارد ہوئے تھے۔ اس پر بحث ہم نے اپنی ایک کتاب میں کی ہے[30]۔ ہمارے اندازے کے مطابق قدیم تاریخ اور آثار قدیمہ کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ریاست دس ہزار سے پندرہ ہزار سال قبل مسیح میں کہیں نمودار ہوئی ہوگی، جو موجودہ چھوٹے ضلعے یا تحصیل کے برابر ہوگی۔

ذہن نشین رہے کہ ریاست کی ابتدا پیشوائیت یا مندروں کے حاکم پروہت اور ان کے مندروں سے ملحق زمینوں اور بڑھتے ہوئے اثر و نفوذ سے ہوئی ہوگی۔ پیشوا افراد زمانہ قدیم کے لوگوں کو مقفع و مسجع کلام، لطیفے، کہانت، جھوٹے قصے سنا کر، داستانیں رقم کرکے، خود کو مقدس اور مظاہر کائنات کو خدا ثابت کرکے حلوے مانڈے کی سیاست کیا کرتے تھے۔ اس قسم کی روحانی مظہریت کی سیاست و سیادت سے آج کا پڑھا لکھا فرد بھی تا حال نہیں نکل پایا ہے، اس قسم کے امور سے اگر قدیم جاہل فرد تک متاثر ہو جایا کرتا تھا تو کیوں ہمارے موجودہ بیچارے عصر حاضر کے نادان فرد کو اس ضمن میں مورد الزام قرار دیا جائے؟۔

ریاست مابعد طوفان نوح

ریاست نامیاتی اور عضوی بالیدگی کے افکار پر یقین کرنے والے مدنیت مفکرین کی رو سے انسانی جسم کی طرح پھلتی پھولتی رہی، مگر یہ کسی منظم منصوبے کے کلیہ کی رو سے وجود میں نہیں آئی تھی۔ یہ اصل میں معاشرتی و سیاسی نمو و بالیدگی طے کرکے تہذیب و تمدن کے سن میں داخل ہوئی تھی۔ اگر آدم علیہ السلام پادری اشر کی بائبلی تفہیم کی رو سے ۴۱۰۰ قبل مسیح میں دنیا میں آئے تھے[31] تو ان کی وفات کے بعد انسانی خوفزدہ و مضطرب وجود چھت و خوراک کی تلاش میں ادھر ادھر بکھر گیا ہوگا، ویسے بھی ہابیل و قابیل کی معرکتہ آرائی نے اعتبار کا خون بڑی فراخی سے سرانجام دیا تھا۔ مگر یہ طے ہے کہ ان کی غالب اکثریت دور نکل کر بھی طوفان نوح تک دجلہ و فرات کی وادیوں تک ہی محدود ہونے پر مجبور تھی۔ اس سے آگے کوئی موجود ہو تو اس کا حال معلوم نہیں پڑتا ہے۔ طوفان نوح تک انسانی شعور عقایدی و فکری طور پر کافی ناپختہ تھا، اس معاشرے کے فرد کے لئے نوحؑ اور ان کی کشتی تعجب خیز تھے۔ اس دور کا انسان شکار، کھیتی باڑی اور دیہاتی دور میں جی رہا تھا۔ آج جس قدر قدیم داستانیں، سامی کتب قرآن، توریت، انجیل، زبور اور تالمود پائی جاتی ہیں۔ ان سے کم از کم نوح کی قوم کے شہری تمدن کا اندازہ اور ان میں کسی حاکم کا حال معلوم نہیں پڑتا ہے، ہاں قبایلی عمایدین اور سرداروں کی بابت قیاس کرنا معلوم پڑتا ہے، توریت میں طوفان نوح کے بعد اچانک مینارہ بابل کی تعمیر اور اس کی تعمیر بعد لسانی اختلاف کا معاملہ صدیوں کے لسانی و نسلی تغیر کو ایک جست میں ممکن بنا دیتا ہے۔ جب کہ ابراہیم علیہ السلام کے دور سے ہمیں مصر میں حاکم اور اُر وغیرہ میں بادشاہ ریاست، مذہبی پروہت کے وجود کا حال کتاب پیدائش سے بخوبی معلوم ہوتا ہے چناچہ کہنا ممکن ہے نوحؑ کے طوفان کے بعد سے ابراہیمؑ تک کے دور کے درمیان میسوپوٹامیہ کی دنیا قبایلی معاشرت سے ترقی کرکے شہری ریاست کے درجہ تک جا پہنچی تھی۔

ہندو داستانوں میں اس ضمن میں منو کا کردار بہت حد تک آدمؑ اور نوحؑ دونوں کا جامع نظر آتا مگر یہاں ایک مسلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ پوران چونکہ بہت بعد میں ویدی ادب کے اساطیری جواز و حکمتوں کو داستانوں کے روپ میں ثابت کرنے کے لئے لکھے گئے تھے لہذا اس میں منو کو بھی ایک بادشاہ یا راجا کی طرح دکھایا گیا ہے، بلکہ پورانوں سے معلوم پڑتا ہے برہما کا پتر پرجاپتی دکش اتنا طاقتور اور بڑا راجا تھا کہ دیوی دیوتا تک اس کی سبھا میں بیٹھا کرتے تھے، دیوی ستی جو شیو کی بیوی تھی وہ بھی اس کی بیٹی تھی جس نے مابعد راجا پتی دکش اور شیو کی کشمکش کے ہاتھوں مجبور ہو کر خود کو سپرد نار کر کے جان قربان کر دی تھی۔

گل گامش کی قدیم ترین داستان کی جو تختیاں ماہرین آثارِ قدیمہ کو ملی ہیں ان سے ضرور ریاست و بادشاہ کی ابتدائی شکل کا حال معلوم ہوتا ہے۔ ریاست کا تعلق تہذیب و تمدن سے رہا ہے۔ اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم جانے جاتے ہیں۔

ریاست کا تہذیب و تمدن سے تعلق

پروفیسر جوڈ[32] نے تہذیب کی تعریف میں کہا ہے کہ: ” تہذیب خوبصورت چیزیں بنانے، آزادی سے سوچنے اور ان اصول و ضوابط پر عمل درآمد کرنے میں مضمر ہے جن کے بغیر لوگ گزر نہیں سکتے ہیں“۔

تہذیبیں جن شرائط پر انحصار کرتی ہیں ان میں ارضیاتی، جغرافیائی، معاشی، نسلی، زبان، اخلاقیات، جسمانی اور حیاتیاتی حالات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ تہذیب جن عناصر سے تشکیل پاتی ہیں ان میں اقتصادیات، سیاسی و معاشرتی تنظیم، مذہب و اخلاقیات اور علم و ہنر اہم عناصر ہیں۔ ثقافت کا تعلق بھی تہذیب کے ساتھ ساتھ ریاست میں آباد مختلف رنگ، نسل، زبان و خصائل کے مالک افراد سے ہوتا ہے۔

جیسا کہ **ای۔بی ٹیلر**[33] نے کہا تھا کہ: ”ثقافت وہ پیچیدہ کل ہے جس میں تکوین و ترتیب، علم، عقیدہ، آرٹ، اخلاق، قانون، رسم و رواج شامل ہیں اور اس میں وہ صلاحیتیں بھی شامل ہوتی ہیں جو انسان نے بحیثیت معاشرہ کے ایک فرد نے حاصل کی ہوتی ہیں“[34]

تہذیب و ثقافت کو بعض لوگ ہم معنی تصور کرتے ہیں، جب کہ تہذیب کا تعلق شہریت، تمدن اور ریاست سے ہوتا ہے۔ دوسری جانب روحانی و اخلاقی جذبات کو چھوتی ثقافت محدود یا وسیع ہر پہلو سے دیہات و شہریت دونوں پر حاوی ہوتی ہے۔ بہر حال مختلف روایتوں اور زمانہ قبل از تاریخ کے آثار کو ملحوظ نظر رکھ کر ریاست کی تاریخ کو پندرہ سے بیس ہزار قبل مسیح قیاساً تصور کرتا ہوں۔ ممکن ہے اس دوران کہیں تحقیقات جاری ہوں، جس کی ہمیں خبر نہیں اور وہ اس کو ۲۵۰۰۰ قبل مسیح تک لے جائیں۔ ولڈیورانٹ جو قدیم تہذیب و تاریخ کا بڑا محقق ہے، وہ زمانہ تاریخ کا آغاز ۳۴۰۷ قبل مسیح سے قبل کرتا ہے۔ اس سے پہلے کے دور کو زمانہ قبل از تاریخ قرار دیتا ہے۔ محققین کا ایک بڑا گروہ اس جانب جھکاؤ رکھتا ہے کہ عراق میں دجلہ و فرات کے وسط کا علاقہ اولین انسانی آبادی اور تہذیب و تمدن کی آماج گاہ رہا ہے۔ بلکہ ان کے مطابق تحریر کا فن بھی وہیں سے شروع ہوا ہے، اور یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ تحریر و تہذیب کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ غالباً اول اول تحریر کی ضرورت ابتدائی طور پر تجارتی مقاصد کے لیے محسوس کی گئی ہو گی۔ جس کے لیے صنعت و حرفت کے اولین مراکز اور تہذیب و تمدن کے وجود کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ مگر اس کے ساتھ یہ امر بھی ہمیں متوجہ کرتا ہے کہ مصری پہاڑی پتھروں سے عمارتیں تعمیر کرتے تھے، اسی لیے وہ باقی رہ گئیں اور اپنی تہذیب کی قدامت دنیا پر ظاہر کر گئیں۔ اس کے مقابلے میں سمیریا و غیرہ اور عراقی بابلی تہذیب کی عمارتیں مٹی کی اینٹوں سے تعمیر شدہ تھیں، جبھی مصر سے قدامت کے باوجود عام لوگ ان کی بابت اتنا نہیں جان پاتے ہیں۔ ان کی قدامت کو قطعی طور پر مصری تہذیب کے مقابل پیش کرنے میں ہم بہر حال دشواری محسوس کرتے ہیں، حلانکہ عمارتوں کی سنگینی عمارت سازی سے قطع نظر میسوپوٹامیہ کی تہذیب کی قدامت جانی مانی شہ سمجھی جاتی ہے۔

میسوپوٹامیہ، مصر و ہندوستان کی قدامت کی فکری جنگیں

مصری تہذیب کی بنیاد پر ان کی ریاست زیادہ قدیم اور شہنشاہی نوعیت کی محسوس ہوتی ہے، جب کہ اس دور کی سمیری ریاستیں موجودہ تحصیل و ضلع سے زیادہ بڑے رقبہ کی حامل نہیں ہوا کرتی تھیں۔ دستیاب تاریخی عدد سے تو مصری ہی بازی لے جاتے نظر آتے ہیں۔ مگر علما کا یہ بھی کہنا ہے کہ وسعت کا معاملہ اصل شے نہیں ہوتا ہے، ریاست کی ابتدا زیادہ اہم ہے۔ اگر حروف تہجی سمیریوں نے ایجاد کیے ہیں تو اولین تہذیب بھی ضرور تاً، وجوداً اور افادیتاً ان کی ہی ہو گی۔ کیونکہ وہاں کے باشندے دستبرد زمانہ کی پہنچ سے بچ کر طوفان نوح کے بعد واپس موجودہ ترکی سے عراق کی سرزمین پر وارد ہو گئے ہوں گے اور انھوں نے شعوراً سو دو سو سال میں

ریاست قائم کر دی ہو گی۔ طوفان نوح کی ایک جدید عمر ۳۰۰۰۰ بتائی جاتی ہے[35]۔ نوحؑ بھی دجلہ و فرات کی وادی کے ایک ما قبل تخلیق ریاست ایک فرزند تھے۔ اندازاً اس دور کی آبادی اسی وادی میں سمٹی ہوئی تھی۔ انسانوں اور ڈائناسارس کا ساتھ بھی تاحال تاریخی طور پر ثابت نہیں ہو سکا ہے۔ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ڈائناسارس زمین پر ۱۶ کروڑ سال قبل مسیح سے ۳۰۰۰۰ قبل مسیح تک موجود تھے، مگر انسانی علاقوں میں ان کا گزر نہ تھا۔ جو مختلف حیاتیاتی اور طبیعاتی وجوہات کی بنا پر وہ معدوم ہو گئے۔ انسان کا یہ عظیم طوفان اس کے بہت بعد یا اریب قریب زمانے میں آنا ایک متکلم فیہ مسلہ ہے۔

اگر انسانی حیات اور قوموں کی تاریخ پر نگاہ ڈالیں تو معلوم ہو گا کہ اب تک دریافت ہونے والا دنیا کا قدیم ترین شہر کامبے بھارتیوں کے دعوے کی رو سے نزد بھارتی گجرات بھی بتایا جاتا ہے۔ اور ایک شہر زیر سمندر رو پمپے کا بھی مشابہتاً رہا ہے مگر پوپمپے کی جڑیں تو بہت بعد میں رومن سلطنت سے جا ملتی ہیں جو نسبتاً کافی نئی ریاست تھی۔ یہ کامبے شہر فروری ۲۰۰۲ میں حادثاتی طور پر سمندر میں آلودگی کی تہہ کا جائزہ لینے والے ماہرین کی نگاہ میں آیا تھا۔ بھارتی صوبہ گجرات کے ساحلوں کے قریب یہ شہر تخمیناً ۷۵۰۰ قبل مسیح میں اپنے عروج پر بتایا جاتا ہے، مگر مسلہ یہ ہے کہ اگر اس بات کو مان لیا جائے تو اس کی قدامت جہاں دجلہ، فرات، نیل کی تہذیب سے قدیم ٹھرے گی وہیں یہ وادی سندھ کی تہذیب اور ہندو رزمیہ داستان کی ریاست سے بھی سقبت لے جایگا، یوں ہندوستان کے آریائی ورود اور ویدوں کی تشکیل کی تاریخ نئی تحقیق کا مطالبہ کرے گی، یہ الگ بات ہے کہ موجودہ بھارتی قوم پرست ریاست نے اب یہ تاریخ سازی شروع کی ہے کہ آریائی کوئی بیرونی حملہ آور نہیں تھے بلکہ وہ مقامی افراد تھے، جبھی شاید اسی سبب اس دریافت کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی ہے اور نا میڈیا نے اس پر زیادہ توجہ مرکوز کی ہے، بلکہ یورپی محققین نے بھی اس قدامت کے دعوے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اس کے کھنڈرات سمندر کی تہہ میں موجود بتائے جاتے ہیں۔ اگر اس شہر کی عمر کا محتاط ترین اندازہ لگایا جائے تو ۲۰۰۰ سال کی بنیاد پر اس کی تاریخ ۹۵۰۰ سال بنتی معلوم پڑتی ہے۔ اور یہ شہر اندازاً طوفان نوح کے سبب سے نہیں بلکہ شدید زلزلے سے ملیامیٹ ہوا تھا[36]۔ اس کے علاوہ فلسطینی شہر جریکو کو ۷۵۰ قبل مسیح اور ایودھیا کو ۹۰۰ قبل مسیح قدیم بتایا جاتا ہے۔ مگر یہ دعوے دیومالائی اساطیر کی بنیاد پر کیے جاتے ہیں، اسی لیے قابل توجہ نہیں ہیں، اسی طرح دمشق کو بھی دنیا کا قدیم ترین مسلسل جینے والا شہر سمجھے جانے والے بھی اس دنیا میں موجود پائے جاتے ہیں۔

صحیح معنوں میں وہ سلطنت، جو کچھ حد تک شہنشاہیت تھی، وہ ۳۴۰۷ قبل مسیح میں پائی جاتی ہے۔ جب مینز(Menes) نامی ایک سردار نے بالائی سے اتر کر زیریں مصر کے علاقوں کو فتح کر کے ممفس(Memphis) تک کا علاقہ اپنی سلطنت میں شامل کیا تھا۔ اور اس نے ایک متحدہ حکومت قائم کی تھی، جس کا دارالحکومت ممفس تھا۔ ہیروڈوٹس کا کہنا ہے کہ اس نے دیائے نیل پر بند تعمیر کر کے دریائے نیل کا رخ ممفس کی طرف موڑ دیا تھا۔ ممکن ہے کہ یہ مبالغہ آرائی ہو، بہر حال تصور کا حال اور ترقی و شعور کی بابت ہمیں اس قسم کی معلومات ضرور میسر آتی ہیں۔ مینز نے مصر میں پہلے حکمران خاندان کی بنیاد ڈالی اور ایک طرح سے قدیم شہنشاہیت کی داغ بیل ڈالی تھی۔ مابعد جس کے شہنشاہوں نے فرعون کا لقب اختیار کیا تھا[37]۔ اندازاً ۳۴۰۷ قبل مسیح سے لے کر ۳۰ء تک مصر پر ۳۳ یا کچھ قولوں کی رو سے چھبیس خاندانوں نے حکومت کی تھی۔ مابعد یہ یہ رومی حکومت کا حصہ بن گیا اور ان سے عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں مسلمانوں نے اسے چھین لیا۔ اور آج تک مصر ایک مسلم عرب ملک ہے۔

ریاست کی ضرورت کیوں پیش آئی

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قدیم افراد کو ریاست قائم کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی تھی؟ غالباً یہ مفادات کے حصول، امن و امان کے قیام، انصاف کی بجا آوری، اور ترقی پذیر ضروریات کی اجتماعی وسیع شکل کے سبب وجود میں آئی تھی۔ اس کی بنیاد باہمی تعاون کرنے، وقت بچانے، زیادہ سے زیادہ آسائشیں حاصل کرنے، بیرونی قوموں سے تعلقات قائم کرنے، عملی سرگرمیاں، تجربات دہرانے اور صنعت و حرفت کا آغاز کرنے کے سبب پڑی تھی۔ یہ بات تجربہ سے شہروں کی تخلیق کے ساتھ سب کو معلوم ہو گئی تھی کہ انسان ساری زندگی صرف زراعت پر انحصار کر کے گزارہ نہیں کر سکتے تھے، اس کی تخلیقی صلاحیتیں اور ہوس اس کو زیادہ دیر تک ایک جگہ محدود نہیں رکھ سکتی تھیں۔ آبادی میں اضافہ، تخصیص کار کے عروج، صنعت و حرفت کی ابتدائی نمو، اور بڑھتی آبادی کے سبب کھیتی باڑی کم پڑ رہی ہے۔ مزید یہ کہ فالتو وقت میں

انسان اکتاہٹ کا بھی شکار ہو چکا تھا۔ وہ اب زیادہ وسیع تعاون و تبادلہ کا مطالبہ کرنے لگا تھا۔ اول انجمنیں کاموں کی بنیاد پر وجود میں آئی ہوں گی۔ ان کے باہمی تصادم و اختلافات نے امن و امان کی صورت حال ابتر کی ہو گی۔ جس کے سبب کوئی منصف فیصلہ کرنے لگا ہو گا اور بتدریج وہ حاکم وقت تصور کیا جانے لگا ہو گا۔

خاندان کی تشکیل کے بعد معاشرتی تنظیم کی سب سے ابتدائی شکل قبیلہ تھی۔ اس سے مراد چند ایسے خاندان تھے جو ایک دوسرے سے نسلی، لسانی طور پر متفق و متعلق تھے، اور جو مابعد بتدریج ارتقائی طور پر کسی قطعہ ارضی پر قابض ہو چکے تھے۔ اور وہ بہت حد تک ہم خیال و ہم مقصد ہوتے تھے، ان کے عقائد ایک ہوتے تھے اور رسم و رواج یکساں نوعیت کے حامل تھے۔ جب بہت سے چھوٹے قبیلے مل جاتے تو ایک بڑے قبیلے کی تشکیل ہوتی تھی۔ یہ ریاست کی تشکیل کی طرف دوسرا اہم قدم تھا۔ قبیلے کے لوگ اپنا سردار منتخب کرتے تھے۔ سردار رفتہ رفتہ بادشاہ کی حیثیت حاصل کر گئے۔ اس طرح بادشاہت کی تنظیم قائم ہو گئی۔ بادشاہ عوام کا نگہبان، فوج کا سپہ سالار اور اعلیٰ پروہت ہوتا تھا۔ جب معاشرے کے اندر جائیداد کے چرچے بڑھے۔ سیاست میں جنگ کی نوبت آئی۔ خاندان میں بھائی سے بھائی جائیداد کے لیے لڑنے لگے۔ شکار گاہوں کی تلاش میں، نئی زمینوں کی تلاش میں یا پھر لوٹ مار کے مقصد سے یا قتل کا بدلہ چکانے کی غرض سے۔ اس طرح قبیلہ دوسرے قبیلے سے برسرپیکار ہوا۔ ایسی صورت میں جائیداد اور جنگ دو خطرناک مسائل بن کر انسان کے سامنے آئے۔ انسان نے ان سے نبرد آزما ہونے کے لیے اپنی سیاسی تنظیم قائم کی۔ جسے ریاست کا نام دیا گیا۔

سوال یہ پیدا ہوا کہ ریاست لوگوں میں اتحاد کیسے پیدا کرے؟ شہریوں میں وفاداری کا جذبہ کیسے پیدا کیا جائے؟ ان کو پرامن شہری بنانے کے لیے کیا تدابیر اختیار کریں؟ اس کے لیے ریاست نے خاندان، اسکول اور مذہبی اداروں کی مدد لی۔ معاشرے کے یہ تین اہم ادارے انسانی اذہان کو متاثر کرتے ہیں۔ جب ریاست کو چلانے کے لیے افراد کی ضرورت پڑی تو حکومت کی تنظیم ریاستی حدود میں کی گئی۔ جس میں اشرافیہ، چند سری، بادشاہ، مطلق العنان فرد، آمر اور جمہوریت جیسے طریقہ ہائے حکومت شامل تھے۔ یہ سوال حل طلب ہے کہ حاکمیت کی ابتداء، قطع نظر مذہبی پروہت، بطور جماعت ہوئی تھی یا پھر بطور فرد واحد ہوئی تھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حکومت کو جن مشکلات کا سامنا تھا، اس کے لیے اس نے قوانین بنانے پڑتے تھے۔ ان قوانین کو کبھی خدا کے نام سے منسوب کیا جاتا تھا اور کبھی حاکم وقت کے نام سے منسوب کیا جاتا تھا، جو خود کو زمین پر خدا کا فرستادہ تصور کیا کرتا تھا۔ اور یہ نظریہ حقوق ربانی سترہویں صدی تک رواج پزیر رہا تھا۔ بعد ازاں جمہوریت کے فروغ اور سیاسی فلسفہ کی ترقی نے اسے ماضی کا حصہ بنا دیا۔ ان قوانین کے نفاذ اور ان کی خلاف ورزی کی صورت میں سزا و تعزیر نے لوگوں کو پرامن بنادیا ہو گا۔ اس طرح ایک حد تک نظریہ جبر و قوت کو پسپائی اختیار کرنی پڑی تھی۔ اب یہ بیرونی جاجیت اور عالمی استیلا تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔

ریاست کے قیام نے جائیداد کو تحفظ دیا۔ شادی و نکاح کی رسم کو قانونی جواز فراہم کیا۔ نتیجتاً حسن کی پوٹلی زن کے حصول کے لیے جنگ کو بھی محدود کر دیا گیا۔ شہری ریاستوں نے جب تجارت کو فروغ دیا تو بیرونی دنیا یا بیرون ریاست اشیاء و اجناس کا تبادلہ شروع ہوا۔ درآمدات و برآمداد کا توازن قائم ہوا۔ حکومتوں کو بھی باہم ایک دوسرے سے مجبوراً تعلقات قائم کرنے پڑے۔ ایلچی اور سفیر کے عہدے مقرر ہوئے۔

عہد قدیم میں انتقام کا جذبہ شعور کی کمی، کثیر ثقافتی نظام کی عدم موجودگی اور قبائلی و پیشہ ورانہ عصبیت کے سبب قوی تھا۔ قدیم فرد کہا کرتا تھا کہ نہیں چھوڑوں گا، سب کچھ ختم کر دوں گا، ایسا سبق سکھا دوں گا کہ سب یاد رکھیں گے۔ مگر شعوری ترقی اور تہذیب و تمدن کے فروغ نے ملکی قوانین کے ذریعے سزا کو اس کا نعم والبدل تصور کر لیا گیا۔ اسی طرح دیت و قصاص کے احکامات بھی بتدریج رائج ہوئے۔ قانون کی بتدریج ترقی نے ریاستوں کو آئین کی ضرورت اور رائج کرنے کی طرف راغب کیا۔ اس طرح انفرادی قانون نے اجتماعی قانون کی طرف سفر کیا۔ یہ تصور شعور نے الوہی کتب سے حاصل کیا۔ اول بادشاہ یا کوئی بڑا فیصلہ کیا کرتا تھا۔ جب اس کی ذمہ داریاں بڑھیں تو قاضی، منصف اور عدالت کا قیام عمل میں آیا۔ ریاست کی ہیت میں ترقی نے ریاست میں اداروں کی تخصیص کار کا پہلو پروان چڑھایا، جو آج مانٹیسکو کے حکومتی تخصیص کار کے اصول کے سبب تقسیم ہو چکا ہے۔ یہ موجودہ جمہوریتوں کا من پسند طریقہ استدلال ہے۔ اس کی رو سے حکومت تین حصوں میں تقسیم سمجھی جاتی ہے: مقننہ، عاملہ اور عدلیہ۔ جدید ریاستی منہج کا تقاضہ ہے کہ تینوں شعبوں اور حصوں کو علیحدہ وظائف سرانجام دینے چاہئیں، نا کہ فرد واحد یا ایک

ہی جماعت اتنے پیچیدہ و مشکل امور سر انجام دیں۔ اس طرح سقراطی اور افلاطونی انصاف کا پہلو کارفرما رہتا ہے اور حکومتی کام کا بوجھ بھی کم ہوتا جاتا ہے۔

معلوم پڑتا ہے کہ مانٹیسکو نے یہ خیال برطانیہ کے مطالعاتی دورے سے اخذ کیا تھا۔ دراصل وہ اس غلط فہمی کا شکار ہو گیا تھا کہ برطانیہ میں تقسیم اختیارات کارفرما ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ بعد ازاں امریکیوں نے اس نظریہ کو اپنی آزاد ریاست میں استعمال کیا، جہاں سے دنیا بھر نے اسے سراہا۔

جب مشرقی دنیا مغربی دنیا کی نو آبادیاتی بنی اور اس کی دولت و خام مال یا افرادی قوت سے مغرب نے اپنی ترقی کی بنیاد رکھی [38]۔ اس کا استحصال کیا اور ظلم و جبر کا نشانہ بنایا، جو علمی و فوجی طور پر کمزور تھے۔ ان کی آبادیاں صفحہ ہستی سے مٹادی گیں۔ جو نسبتاً ترقی یافتہ اور باعلم تھے، ان کو علمی اقدار کی تبدیلی کے ذریعے جاہل بنادیا گیا اور نئے تہزیبی معیارات کا اسیر بنانے کی کوشش کی گئی۔ انہیں ان کے ماضی و اقدار سے غافل کر دیا گیا اور اپنی ذاتی سیاسی تہذیب و افکار انہیں سکھائے گئے، جنہیں یہ خود صحیح طرح بروئے کار نہیں لا رہے تھے۔

لاطینی امریکا و شمالی امریکا میں امریکا، فرانس، اسپین اور برطانیہ نے جو کچھ کیا وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ وہاں کے مقامی معدوم کر دیے گئے یا اقلیت میں تبدیل ہو گئے۔ ہندوستان اور چین نستباً بڑے اور طاقتور باعلم ممالک تھے۔ انہیں جسمانی طور پر ختم نہیں کیا جا سکتا تھا، تو ان کے اقدار تبدیل کر کے ان کو ذہنی غلام بنادیا گیا۔ اس طرح جو تاریخ لکھی گئی وہ مقامی افراد میں نفرت و عناد کے جذبات پروان کر گئی۔ مشرق نے یہ قبول کر لیا کہ اولین شہری ریاستیں یا تہذیبیں یونان و روم سے پیدا ہوئیں۔ یہ ہم واضح کر چکے ہیں کہ انسان نے نسل کی ابتدا جب عراق میں دجلہ و فرات سے کی تو ارتقائی تسلسل کے بعد لازمی بات ہے کہ شہری ریاستوں و تہذیبوں کی ابتدا بھی یہیں سے ہوئی ہو گی۔

ریاست کا شعوری، سیاسی و تاریخی ارتقا

گزشتہ صفحات پر اس حوالے سے کامبے، گجرات اور مصر کی مثالیں پیش کی ہیں۔ ریاست و شہر کے تصور کی ایک قدیم و معتبر روایت جو یہود و نصاریٰ کے نزدیک معتبر ہے اور عہد نامہ قدیم سے اخذ کردہ ہے، دلیل کے طور پر ذیل میں پیش کی جارہی ہے:

"اور تمام زمین پر ایک ہی زبان اور ایک ہی بولی تھی [39] پھر ایسا ہوا کہ مشرق کی طرف سفر کرتے کرتے ان کو ملک سنعار میں ایک میدان ملا اور وہ وہاں بس گئے۔ اور انہوں نے آپس میں کہا کہ ہم اینٹیں بنائیں اور ان کو آگ میں خوب پکائیں سو انہوں نے پتھر کی جگہ اینٹ سے اور چونے کی جگہ گارے سے کام لیا، اور پھر انہوں نے کہا آؤ ہم اپنے واسطے ایک شہر اور ایک برج جس کی چوٹی آسمان تک پہنچے بنائیں اور یہاں اپنا نام کریں۔ ایسا نہ ہو کہ ہم تمام روئے زمین پر پراگندہ ہو جائیں [40]۔"

یہ روایت عہد نامہ قدیم میں توریت کی کتاب پیدائش کے اس باب سے تعلق رکھتی آیات میں شامل ہے جو طوفان نوح کے بعد بابل کے شہر و برج کی تعمیر کے سلسلے میں وارد ہوئی ہیں۔ طوفان نوح کے فوری بعد ان آیات کا آنا ظاہر کرتا ہے کہ جیسے ہی زمین خشک ہوئی اور نوح واپس اپنی سرزمین آئے تو انہوں نے بابل کی بنیاد رکھی۔ مگر ان آیات میں کسی جگہ نوح کا ذکر نہیں ملتا ہے۔ البتہ یہ ظاہر ہے ہوتا ہے کہ کچھ صدیوں بعد انسانوں نے یہاں کوئی شہر تعمیر کیا تھا۔

گزشتہ صفحات میں ناچیز طوفان نوح کی جدید تاریخ ۳۰۰۰۰ قبل مسیح کے قریب بتا چکا ہے، جبکہ اسرائیلی روایات اسے دو ہزار قبل مسیح کے اریب قریب بتاتی نظر آتی ہیں۔ ایک مشہور قول طوفان نوح کو ۲۵۰۰ قبل مسیح کے قریب بتاتا ہے، مگر درحقیقت یہ سب اعداد و شمار ماہرین اکتشافات و مورخین کے ظن و تخمین سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس طرح قیاساً وادی دجلہ و فرات میں شہر کی بنیاد ۲۹۰۰۰ قبل مسیح کے اریب قریب ہو گی۔ ابراہیم علیہ السلام جو دجلہ و فرات کی وادی میں پیدا ہوئے تھے اور ار سے ان کا تعلق بیان کیا جاتا ہے اور جنھیں بنو اسرائیل و اسماعیل کا جد امجد سمجھا جاتا ہے، کے دور میں مصر، کنعان، دجلہ و فرات کی حکومتوں کا حال معلوم پڑتا ہے۔ کتاب پیدائش باب ۱۵: میں اس کا حال بیان ہوا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام ۲۱۶۰ قبل مسیح میں قدیم عراق جسے بابل و کلدانیہ کہتے ہیں، میں موجودہ بصرہ کے قریب شہر اسد تل العبید جدید میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے ہی موجودہ مکہ کی داغ بیل ۲۰۷۲ قبل مسیح میں ڈالی تھی [41]۔

لہذا ۱۷۰۳۴ قبل مسیح ہو یا ۷۵۰۰ قبل مسیح کا قرار کردہ شہر کامبے ہو، اس وقت سے ۲۷۰۲ قبل مسیح تک اس دوران لاتعداد چھوٹی چھوٹی شہری ریاستیں مشرق میں آباد ہو چکی تھیں۔

جیسا کہ ایچ جی ویلز اس بابت کہتا ہے کہ :"انہی علاقوں میں ابتدائی تہذیبوں کے آثار دریافت ہوئے ہیں۔ زیریں میسوپوٹیمیا اور مصر میں وحشی قبائلی دیہاتوں سے ترقی یافتہ اولین شہروں، مندروں اور باقاعدہ آب پاشی اور سماجی تنظیم کے شواہد ملے ہیں۔ اس زمانے میں دریائے دجلہ وفرات مختلف دھانوں سے خلیج فارس میں جا گرتے تھے۔ انہی دونوں کے بیچ موجودہ ملک میں اہل سمیر نے اپنے اولین شہر قائم کیے تھے۔ تقریباً اسی دور میں مصر کی عظیم تاریخ کا آغاز ہوا۔ گو اس بارے میں تاریخی شواہد واضح نہیں ہیں۔ اہل سمیریا بھوری رنگت اور بڑی ناکوں والے تھے۔ وہ خامی زبان لکھتے تھے[42]۔ انہوں نے کانسی کا استعمال سیکھا اور سورج کی حدت میں تپائی ہوئی اینٹوں سے عظیم میناروں والے مندر تعمیر کیے۔ اس ملک کی مٹی بہت اعلیٰ ہے وہ اسے لکھنے کے لیے استعمال کرتے تھے اور انہی پر ان کی تحریر محفوظ صورت میں ہم تک پہنچتی ہے[43]۔"

ہمیں ہندوؤں کی رزمیہ داستانوں رامائن و مہابھارت سے بھی ہندوستان میں مختلف ریاستوں کا حال معلوم ہوتا ہے۔ ان کا دور ۱۲۰۰ قبل مسیح سے ۸۰۰ قبل مسیح تک بتایا جاتا ہے۔ وادی سندھ کی تہذیب جو شہری حکومت کا منہ بولتا نمونہ ہے، یہ آج سے ۳۲۵۰ قبل مسیح اور ۲۷۵۰ قبل مسیح کے دوران موجود تھی۔ اندازاً یہ پانچ ہزار سال قدیم تہذیب سمجھی جاتی ہے۔ سندھ کی تہذیب مصر، بابل، سمیریا اشوری تہذیب کی ہم عصر تہذیب تھی۔ اس تہذیب کی وسعت کا اندازہ ایک ہزار میل کے قریب لگایا گیا ہے[44]۔ یہ عمل داری میں بابل سے چار گنا اور مصر سے دوگنا وسیع علاقے تک محیط تھی۔ اندازے کے مطابق اس احاطے میں ہزاروں بستیاں مختلف عہدوں میں موجودہ مٹی کی سطح کے زیر زمیں کئی تہوں تلے آباد رہی ہوں گی۔ باقیاتی دریافت کی رو سے موہنجودارو، ہڑپہ، موہن جو دارو، ستکاجن، دور، علی مراد، آمری، داہر کوٹ اور کوٹ ڈیجی اہم ہیں۔

موہنجودارو ضلع لاڑکانہ میں کراچی کوئٹہ ریلوے لائن پر ڈوکری اسٹیشن سے سات میل دور واقع ہے۔ دریائے سندھ اس کے مشرق میں بہتا ہے[45]۔ کسی بلند مقام پر کھڑے ہو کر اس بستی کا جائزہ لیا جائے تو ایسا معلوم ہوگا کہ اس بستی میں چھ سات محلے تھے۔ ہر محلہ شمالاً جنوباً ۱۲۰۰ فٹ اور شرقاً غرباً ۸۰۰ فٹ علاقے پر مشتمل تھا۔ ان محلوں کو وسیع شاہراہیں ایک دوسرے سے جدا و قطع کرتی محسوس ہوتی ہیں۔ یہاں اسٹوپہ، بڑا حوض، جامعہ کی عمارت، لاتعداد مکانوں، گلیوں اور بے شمار کنوؤں کے آثار ملے ہیں۔

اسی طرح ہڑپہ کی تہذیب جو ضلع ساہیوال (سابقہ منٹگمری) سے پندرہ میل دور کراچی لاہور ریلوے لائن کے اسٹیشن ہڑپہ روڈ سے چار میل فاصلے پر موجود ہے۔ رگ وید میں جو لفظ "ہاری یوپویا آیا ہے۔ بعض محققین نے اسے ہڑپہ کی اصل گردانا ہے اور یہ رائے دی گئی ہے کہ یہاں کوئی بڑی جنگ لڑی گئی تھی۔ یہاں سے غلہ کی کوٹھی، کاریگروں کے کوارٹرز، شہر پناہ اور دو قبرستانوں کی دریافتیں ملی ہیں۔ ان کی ہمہ گیر ترقی سے یہ اندازہ قائم کیا گیا ہے کہ یہاں منصوبہ بند شہری آبادی لازماً کسی بلدیاتی نظام کی سبب قایم ہو گی۔ موہن جو دارو کے بڑے جال کو بلدیاتی حکومت کو صدر دفتر گردانا جارہا ہے۔

علی عباس جلالپوری کا کہنا ہے:

"آسٹر پلائڈ اور بحیرہ روم کی نسل کے اختلاط سے دراوڑی نسل معرض وجود میں آئی۔ دراوڑوں نے کھیتی باڑی شروع کی، جانور پالنے لگے اور شہر بسا کر رہنے لگے۔ زمانے کے گزرنے کے ساتھ ان کے تجارتی روابط قدیم عراق کے متمدن سمیریوں سے استوار ہوگئے۔ ان تمدنوں کی اولیت کے بارے میں اختلاف ہے۔"

یہ تمدن سمیریا کی طرح تھا۔ جب کہ ہال کے خیال میں سمیریا کا تمدن بذات خود ہڑپائی تمدن کی ایک شاخ ہے۔ میکڈانالڈ کا اندازہ ہے کہ: اتنا یقینی ہے کہ وادی سندھ کے جہاز راں بحری سفر کر کے سمیریا اور بابل تک جایا کرتے تھے۔ اس بات کے شواہد بھی موجود ہیں کہ جب مصر میں بڑا اہرام تعمیر کیا گیا اس وقت ہڑپہ اور موہن جو دارو کا تمدن عروج پر تھا"۔

اختتامیہ

اس کل بحث سے یہ اندازہ قایم کیا جاسکتا ہے کہ ریاست ایک ارتقائی تاریخی و سیاسی وجود کا نام ہے، جو صدیوں کے، ذہنی و شعوری ارتقاو تسلسل کی دین ہے جہاں سے مابعد جدید نشاۃ ثانیہ کی میکاولین قومی ریاست کا تصور ابھرا جو یورپ کے ذریعہ دنیا بھر میں اس کی نوآبادیت تک بتدریج راسخ و رائج رہا، تمام تاریخی و نظری بحث کے باوجود ہم ریاست کی تاریخ کی عمر و ابتدا کو قدامت کی رو سے صد فیصد مقرر کرنے سے قاصر ہیں، اتنا تو طے شدہ امر ہے کہ پدر سری معاشرت کی مادر سری معاشرت پر فتح، اور مذاہب کے عروج نے جدید باشعور ریاست کو قایم و دایم کیا تھا، جو اس عہد تک ارتقائی طور پر شہری بلدیات سے شہنشاہت تک ترقی کر چکی تھی۔ لہذا

ریاست و حکمرانوں کی بابت ہم یقینیت سے صرف تاریخی کتب پر کچھ حد تک اعتماد کرسکتے ہیں، باقی آثار قدیمیہ سے تاریخ کا تعین نسبتاً ایک جدید طریقہ کار ہے، جس کا تعلق خالصاً انکشافاتی مکتبہ لہذا اس اطلاقی نوعیت کی تاریخ سازی سے براہ راست رجوع کرنا ماہرین سیاسیات کے مشکل امر ہے۔ مجبوراً اس ضمن میں سیاسی ماہرین، سیاسی و تاریخی مورخین اور قیاسی فلسفہ سے رجوع کرنے میں مجبور ہو جاتے ہیں، مگر یہ طریقہ کار بھی کچھ حدود بندیوں کے سبب تمام تحقیقات کی بابت کوئی صد فیصد بات کرنے سے قاصر محسوس ہوتے ہیں یوں تاریخی کتب اور آثار قدیمیہ کی دریافت و تحقیقات کے مجموعی مشاہدے و مطالعے سے ہم مبالغہ سے بچے بغیر اتنا یقینی کہہ سکتے ہیں دنیا میں دس ہزار سے پانچ ہزار قبل مسیح کے وسط میں ریاست کی ابتدا ہو چکی تھی۔

حوالہ جات

حوالہ جات:

[1] کیرانوی، وحید الزماں۔ الجدید القاموس الاصطلاحی: کراچی: دار الاشاعت: صہ 273۔

[2] ایضاً، صہ 471۔

[3] بشیر احمد صدیقی، پروفیسر۔ جواہر اللغات: لاہور: کتابستان پبلشنگ کمپنی: صہ 685۔

[4] آل۔ عمران: ۲۶۔

[5] ابن منظور۔ لسان العرب: بیروت: دارالصادر: جلد 7:، صہ 321۔

[6] کسی خطہ ارض پر دیہاتوں اور شہروں کے مربوط قانونی و آئینی اتحاد کو ریاست کہتے ہیں۔

[7] Toynbee, A.J.A۔ A Study of History: Vol-1: p:29:OUP:1949.

[8] Common Wealth.

[9] The Prince.

[10] جدید ریاست و قومیت کا تصور میکاؤلی کی پرنس (1532) سے ابھرا ہے۔ معج

[11] اصغر علی شاہ جعفری، سید۔ مغربی سیاسی افکار: لاہور: شیخ محمد بشیر اینڈ سنز: صہ 152۔

[12] Divine right of kings۔

[13] معاہدہ عمرانی کی رو سے ریاست لوگوں نے باہمی معاہدہ کرکے قائم کی تھی جو کہ ایک نظری مفروض شدہ تمثیلی بیانیہ سمجھا جاسکتا ہے۔ معج

[14] Leviathan۔

[15] طاقت کا راج اور نظریہ جبر و قوت کے مطابق حکومت و ریاست طاقت کے بل بوتے پر قائم ہوتی ہے۔ یعنی جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا تصور اہمیت کا حامل ہوتا ہے، اسے بہ حیثیتِ مجموعی نظریہ سے زیادہ عملی اظہاریہ سمجھا جاسکتا ہے۔ معج

[16] Two Treatise on Civil Government۔

[17] Social Contract۔

[18] Georg Wilhelm Friedrich Hegel۔

[19] ریاست کی بابت دو مکتب فکر پائے جاتے ہیں: ایک کا کہنا ہے کہ ریاست خود مقصد ہے۔ فرد کی بہتری، اس کی ترقی اور عظمت اسی میں پنہاں ہے۔ ریاست کے بغیر کوئی بھی فرد زندہ نہیں رہ سکتا ہے۔ دوسرے مکتب فکر کا کہنا ہے کہ انسان ہی اصل مقصد ہے، اور معکوساً ریاست اس کے تابع ہے، بلکہ ریاست انسان کی فلاح و بہبود کے لیے قائم کی جاتی ہے۔ معج

[20] Jeremy Bentham۔

[21] The CommunistManifesto۔

[22] Hans Kelsen: General Theory Of Law And State.

+ آسٹرین قانون دان اور مفکر

[23] Oscar Ichazo :بولیوین مفکر۔

[24] State. Encyclopedia Britannica, EB:DVD: Ultimate Reference Suit: Chicago: EB: 2010.

[25] ارسطو، مثالی ریاست: (ترجمہ: امجد محمود) لاہور: بک ہوم: 2005ء: صہ 42۔

[26] ایضاً، ص 43

[27] عبدالرحمن ابن خلدون، علامہ، مقدمہ ابن خلدون، لاہور: المیزان، 2005ء، ص 169-70۔

[28] سبط حسن، سید۔ نوید فکر: کراچی: مکتبہ دانیال: 2002ء: صہ۔4۔

[29] سبط حسن۔ محولہ بالا۔ صہ 5۔

30 اولین شہری ریاستیں میسوپوٹیما، مصر اور شام میں نمودار ہوئی تھیں۔ معج

31 یہ تاریخ اور اس قسم کے دعوے یہود و نصاری سے اخذ شدہ اسرائیلی و بابلی مواقف سے زیادہ کچھ نہیں ہیں۔ منعج

32 C. E. M. Joad۔

33 Edward Burnett Tylor :Anthropologist.

34 ول ڈیورانٹ: انسانی تہذیب کا ارتقا: طبع فکشن ہاوس۔ لاہور۔[یاسر جواد کی ترجمہ شدہ جلد اول دیکھیں۔ تہذہب کی کہانی کی جلد اول: سے اخذ شدہ مختصر تلخیص]۔ معج-

35 ذوالفقار ارشد گیلانی نے اپنی کتاب تاریخ انبیا میں ان جدید عمروں کا ذکر کیا ہے۔ معج

36 گیلانی، ذوالفقار ارشد، تاریخ الانبیاء، علم دوست پبلی کیشنز، صہ 37-38۔

37 ہاشمی، انور، تہذیب کی کہانی، کراچی: پاکستان بک سینٹر، صہ 4۔

38 مغرب کی ترقی اس کی ذہنی لیاقت اور مشرق کے وسائل و افرادی قوت کے سبب ممکن ہوئی۔ معج

39 توریت کے مطابق اولین انسان ایک جگہ رہتے اور ایک ہی زبان میں گفتگو کیا کرتے تھے۔ معج

40 کتاب مقدس، لاہور: پاکستان بائبل سوسائٹی، 2007ء، کتاب: پیدائش، باب: بابل کا برج: آیت 1-11 تا 4-11، صہ 17-18

41 گیلانی، ذوالفقار ارشد۔ محولہ بالا: صہ 62-69۔

42 اہل سمیر نے ہی اول اغلباً لکھنے کا طریقہ ایجاد کیا تھا۔ معج

43 ویلز، ایچ جی، مختصر تاریخ عالم، لاہور: تخلیقات، 2007ء، صہ 7۔

44 Marshal, Sir john. Moenjodaro and The Indus Civilization ,Arthur Prohbstian.london.1931. Vol-1.

45 وادی سندھ کی تہذیب شہری بلدیاتی حکومت کا واضح ثبوت ہے۔ معج